رشید احمد صدیقی بحیثیتِ نقاد

ڈاکٹر محمد رحمان

Dr. Muhammad Rehman

Assistant Professor, Department of Urdu,
Hazara University, Mansehra.

ڈاکٹر مطاہر شاہ

Dr. Mutahir Shah

Assistant Professor, Department of Urdu,
Hazara University, Mansehra.

Abstract:

Rahseed Ahmad siddiqui is known as Humerist in Urdu literature and he holds on in individual place in this regard.Apart from this he is also known a Critic.He has Written a few very famous essays in Criticism, which includes "jiggar mari nazar main","urdu Ghazal" and "Muqaddima E Baaqiat E Faani".Similarly his famous "Criticle Quotes" also proves him a good Critic.His unique sentences and witty statments are very famous in Crticism.This article proves him as a true Critic in this regard.

رشید احمد صدیقی صاحبِ اسلوب نثر نگار اور شعروادب کے بڑے اچھے مزاح نگار ہیں۔ان کی تنقیدی تحریریں اردو ادب کے تنقیدی سرمایہ میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کی تنقید اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتی ہے۔وہ اپنے ذہن میں اپنے موضوع کا دائرہ عمل طے کر لیتے تھے جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ مضمون کا پہلا مسودہ تیار کر لیتے تھے۔اس عمل کے دوران اور اس کے بعد بھی بہت سے نکات، خیالات اور تبصرے ان کے ذہن میں بازگشت کرتے رہتے تھے جن کو وہ اصل متن میں اس طرح ضم کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ان کا اصل متن مجروح نہ ہو اور اس کی روانی پر بھی اثر نہ پڑے۔یہ کام رشید صاحب کے لیے خاصا مشکل ہوتا تھا کیوں کہ گول سوراخ میں چوکور میخ کا بٹھانا ان کے لیے مشکل ہوتا تھا۔وہ ان بازگشتوں کو ''مفردات'' کی طرح ان رقعوں پر تحریر کر لیا کرتے تھے۔پھر

ان کے لیے مناسب و موزوں جگہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ امر ہر صاحب قلم کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ رشید صاحب اس امتحان میں ہمیشہ پورے اترے۔ ان کی تحریر جب بھی تراش خراش کے آخری مرحلے سے گزر کر اشاعت پذیر ہوتی تو اس میں کوئی منطقی جھول نہیں ہوتا تھا۔ ان کی رائے میں کوئی کمی یا رشید صاحب کی ہی اصطلاح میں ''کوبڑ'' نہیں پایا جاتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے قلم سے نکلے ہوئے ہر فقرے اور جملے کی ذمہ داری خود محسوس کرتے تھے اور اس معاملے میں خاصے محتاط تھے۔ اتنا ہی نہیں وہ اس کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ تحریر خشک، بوجھل اور بے کیف نہ ہو۔ اس کا فائدہ ان کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے پہنچتا تھا۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں پر بھی ان کی طنز و مزاح نگاری غالب رہتی تھی بلکہ توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانی ہے کہ وہ تنقید میں بھی شگفتگی کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔

رشید صاحب پیشہ ور نقاد کی حیثیت سے خود کو متعارف کرانا نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے نظریہ سازی یا اصولی مضامین لکھنے میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ وہ عموماً ابتدائی و تعارفی سطور میں موضوع کی تاریخی پس منظر کا خلاصہ پیش کیا کرتے تھے۔ صرف ''جدید غزل'' ان کی ایسی واحد کتاب یا تحریر ہے جس کی ابتداء میں انہوں نے تھوڑی بہت اصولی و نظری باتیں بھی لکھی ہیں لیکن ان تذکروں میں انہوں نے کبھی فکری یا فلسفیانہ باتیں نہیں کیں۔ سوائے اس کے کہ انہوں نے اپنے مؤقف کو اپنی ذاتی رائے بنا کر پیش کیا ہے۔ بعض مواقع پر ایسا بھی ہوا ہے کہ انہوں نے کوئی شوخ جملہ یا فقرہ ''جملۂ معترضہ'' کے طور پر لکھ دیا اور وہ ان کی رائے سے منسوب کر دیا گیا۔ یہ الزام ایک لحاظ سے درست بھی ہوتا تھا کیوں کہ رشید صاحب خود کو آسانی سے گرفت نہیں میں آنے دینا چاہتے تھے۔ وہ سب کچھ کہنے کے باوجود اپنے آپ کو ''بری الذِمہ'' رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے ''جملہ ہائے معترضہ'' کو اہمیت کسی غلط فہمی یا کم فہمی کی بنا پر نہیں دی گئی بلکہ رشید صاحب کی اس گہرائی کی وجہ سے دی گئی جو ان جملوں میں مضمر ہوتی تھی۔ یہ جملہ ہائے معترضہ ایک نوعیت سے وہ حاصل مطالعہ ہوتے تھے جو رشید صاحب اپنی ذہانت کی بنا پر ایک جملے میں بہت جامع انداز میں پیش کر دیتے تھے۔ رشید صاحب کے ''جملہ ہائے معترضہ'' نقادوں کے درمیان جس قدر مقبول ہوئے اتنے کسی بھی نقاد کے محاکے معروف نہ ہو سکے۔ یہ رشید صاحب کا امتیاز بھی ہے اور ان کے قارئین کی طرف سے ان کا اعتراف بھی۔ شاید ان جملوں کی جامعیت ہی کی وجہ سے کلیم الدین احمد انہیں دماغی کاہلی اور طبیعت کی کج روی کا حامل قرار دیتے تھے۔ مگر ایک ہی سانس میں انہیں ان میں ایک کامیاب نقاد کے امکانات بھی نظر آتے تھے۔ کلیم الدین احمد نے ''زخم و مرہم'' میں رشید صاحب کا قابل توجہ اعتراف کیا ہے۔ رشید صاحب جب ایک فقرے میں بہت بڑی بات کہہ سکتے تھے تو انہوں نے تفسیر و تیسیر کا طریقہ کیوں نہ اختیار کیا؟ انہوں نے وضاحت اور استدلال کے ساتھ اپنی رائے کیوں نہ پیش کی؟ اگر وہ ایسا کرتے تھے تو یقیناً وہ دماغی کاہلی کا مظاہرہ نہ کرتے اور اردو تنقید میں قابل

قدر اضافہ نہ کرتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے کلیم الدین احمد نے انہیں سلاست روی سے عاری نقاد قرار دیا۔(۱)

رشید احمد صدیقی نقاد بننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے قلم کی لگامیں کھینچے رکھیں اور خود کو نقاد نہ بننے دیا لیکن ان کے اندر کا وہ صاحبِ بصیرت کبھی بھی گرفت میں نہ آ سکا جو ادب پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی کبھی ایک جملے ہی میں سہی اپنے وجود کی چغلی کھا جاتا تھا۔ ان کے بہت سے ''جملے ہائے معترضہ'' اتنے معروف و مقبول ہوئے کہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس وجہ سے بہت سے نقادوں نے ان کے جملوں کو اپنے مزاج کے مطابق استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ملاحظہ ہوں:

> ''شاعری برائے شاعری اسی طرح فعل عبث ہے جس طرح شاعری برائے مقاصد۔''
>
> ''شاعر، ادیب یا آرٹسٹ نہ زمانے کے پابند ہوتے ہیں نہ زندگی کے، نہ نقاد کے۔ زمانہ، زندگی اور نقاد تینوں شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کے منتظر ہوتے ہیں، زمانہ ان کا پابند ہوتا ہے یہ زمانے کے پابند نہیں ہوتے۔''
>
> ''ایسی شاعری کس مصرف کی جس سے ہم نہ شاعری کی بڑائی محسوس کریں، نہ شعر کی، نہ شاعر کی، نہ اپنی، نہ بہ حیثیتِ مجموعی زندگی کی''
>
> ''شعر ہو، ادب ہو، زندگی ہو، فن ہو۔ سب لا طائل ہیں اگر حیا کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ بے حیائی و بے غیرتی فن نہیں معصیت ہے۔''
>
> ''شاعری کو حقیقت اور ''انسانیت'' کا ترجمان ہونا چاہئے نہ کہ وہ کس زبان، کس قوم، کس ملک، کس زمانہ اور کن روایات کا ترجمان ہے۔''(۲)

اُردو غزل پر حسرت موہانی کے احسانات طرح طرح سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات تقریباً ہر ایک نے دہرائی ہے کہ بیسویں صدی میں غزل کی نشاۃ ثانیہ حسرت کی مرہونِ منت ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے حسرت کے متعلق یہی بات کہی ہے۔ ملاحظہ ہوں:

> ''انہوں (حسرت) نے نہ صرف غزل کو از سرِ نو زندہ کیا اور اس کو اس کی کوئی ہوئی آبرو واپس دی بلکہ اس کو ایک نیا وقار بخشا، حال کی اصلاح و ترغیب کے باوجود غزل کی اصلاح و ترقی کی طرف کسی کا دھیان نہیں جا رہا تھا اور ہم کو کسی طرف سے امید نہ تھی کہ اردو غزل

سنبھالا تو خیر کیا کوئی نئی کروٹ بھی لے گی۔ یکا یک ہمارے کان
غزل کی ایک نئی آواز سنتے ہیں جو ہر لحاظ سے نئی تھی مگر کسی اعتبار
سے بھی اس کو بدعت یا بد راہی نہیں کہہ سکتے۔ یہ حسرت کی آواز
تھی۔''

لیکن ان کا انداز ایسا نہیں جیسا رشید صاحب کا ہے۔ دیکھئے وہ اس بات کو کتنے چبھتے ہوئے انداز میں کہتے ہیں:

''یہ کہنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ حسرت کا غزل پر بڑا احسان
ہے اور میرے نزدیک جس کا غزل پر احسان ہے اس کا پوری اردو
شاعری اور اردو زبان پر احسان ہے، حسرت نے غزل کی آبرو اس
زمانہ میں رکھ لی جب غزل بہت بدنام اور ہر طرف سے نرغے میں
تھی۔ انہوں نے اردو میں غزل کی اہمیت اور عظمت ایک نامعلوم
مدّت تک منوالی۔'' (۳)

حسرت ہی کے متعلق رشید صاحب کے دو جملے اور بھی سن لیجیے لیکن ان جملوں میں جو بات کہی گئی ہے اسے پہلے آل احمد سرور کے لفظوں میں دیکھ لیجئے۔ لکھتے ہیں؛

''ان کا حسن و عشق، ان کے ہجر و فراق سب اسی دنیا کی چیزیں ہیں،
مگر انہوں نے ان میں ایک ابدی چاشنی بھر دی ہے اور زمان و مکان
سے بے نیاز کر دیا ہے۔ حسرت نے عام حالات و واقعات بیان
کئے ہیں۔ حسرت نے گھریلو فضا کے حسن کو دیکھا ہے اور اس دنیا کی
عورت میں حور آسمانی کا تقدس اور جمال دکھایا ہے۔'' (۴)

تقریباً انہیں خیالات کو رشید صاحب یوں بیان کرتے ہیں؛

''انہوں نے (حسرت) نے اپنی عاشقی کو قضیۂ زمین برسرِ زمین ہی
رکھا۔ اس کو نہ آسمان پر لئے پھرے نہ ویرانوں میں بھٹکنے دیا۔
انہوں نے اپنے عشق کو نہ گاؤں سدھار کا خلیہ بنایا نہ بغاوت اور
انقلاب کا وسیلہ۔ نہ یزدان اور اہرمن کا مسئلہ حسرت اور جگر دونوں
اصلاً اسی دنیا کے محبوب کی موجودگی میں اور جگر محبوب کی دوری پر
غزل خواں ہوتے ہیں۔'' (۵)

اب تک رشید صاحب کے جتنے اقتباسات دیئے گئے ہیں ان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جن خیالات و افکار کے اظہار میں رشید صاحب کا قدم یا قلم درمیان میں آیا وہاں بڑے بڑے چراغوں کی

روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ یہ بات زیادہ حیرت انگیز اس لیے ہے کہ ان کے یہاں نہ زبان کی نمائش ہے اور نہ بیان کے پینترے۔ وہ جس بات کو جس انداز میں کہہ دیتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں الفاظ و انداز میں وہ بات نہ صرف ان کے ذہن میں آئی ہوگی بلکہ وہی الفاظ و انداز اس بات کے لیے سب سے زیادہ فطری اور سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ اس کے علاوہ فقروں اور جملوں کی جو خوبی یا خصوصیت پڑھنے والوں کو زیادہ محظوظ و متاثر کرتی رہی ہے وہ ان کے فقروں اور جملوں کا اچھوتا پن ہے۔ رشید صاحب کی ساری بے تکلّفی و بے ساختگی اور اہتمام و التزام سے بے نیازی کے باوجود ان کے فقروں اور جملوں میں ایک عجیب سی اساسیت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ یا اس انداز و ساخت کا جملہ رشید صاحب ہی لکھ سکتے تھے۔ اس لفظ یا اس انداز و ساخت تک دوسروں کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اُردو کے دوسرے انشاء پرداز اپنی تحریروں کی مجموعی فضا سے پہچانے جاتے ہیں۔ رشید صاحب اپنے ہر جملے کے دو ایک لفظوں کی آڑ سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات ان کے فقروں اور جملوں کی اساسیت کا سارا دارومدار ایک لفظ پر ہوتا ہے۔ مثلاً ان کا یہ جملہ بہت مشہور ہو چکا ہے ''ہم مغرب کا نام لے کر جب اور جس طرح چاہتے تھے مشرق کو سنگسار کر دیتے تھے''۔ اس میں ایک لفظ ''سنگسار'' نے پورے جملے کو اساسی بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں رشید صاحب کی دو ایک ایسی عبارتیں بھی دیکھتے چلیے جن کی ندرت کا انحصار فقروں اور جملوں کے انداز و ساخت پر ہے۔ ایک جگہ اکبر کے متعلق لکھتے ہیں؛

> ''انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز (تقریباً پچاس سال تک) کی ہماری پوری داستان حوصلہ و ہوس کی الفت و آویزش کی پیش قدمی و پسپائی کی، شور و سکوت کی، سود و زیاں کی، اکبر کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔ کہیں خفی، کہیں جلی، کہیں شگفتہ، کہیں خزیں لیکن ہر جگہ دل نشیں۔ اس عہد کے اشعار اور شعور کو سمجھنے کیلئے اکبر کے کلام سے ہر طرح کی مدد لی جا سکتی ہے۔ شاید اتنی قیمتی مدد اور کہیں سے حاصل بھی نہیں ہو سکتی۔ شاعر کے کلام میں زمانہ اور زندگی کی جھلک ضرور ملتی ہے۔ لیکن اکثر وہ نقوش اتنے واضح اور اتنے جیتے جاگتے نہیں ہوتے (اکبر کے)۔ دوسروں کے یہاں اس کے نقوش دریافت کرنے پڑتے ہیں۔ بڑی چھان بین، بڑی الٹ پھیر، اکثر خواہ مخواہ کی خوش عقیدتی یا سوئے وطن کو دخل دینا پڑتا ہے۔ اکبر کے یہاں یہ بات نہیں۔ ہر بات پوری دلالیت، قومیت، سکونت، پیشہ اور خلیہ کے ساتھ کہیں قلندرانہ آہنگ میں، کہیں شاعرانہ رنگ میں، کہیں تراش خراش کے ساتھ، کہیں جوں کی توں،

کہیں روایتی اور کہیں انقلابی۔'' (۶)

ایک جگہ ذاکر صاحب کے متعلق لکھتے ہیں؛

''ذاکر صاحب کے تین اور بھائیوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ یہ خاندان تقریباً بارہ سال تک علی گڑھ کی رزم و بزم میں پورے طور پر بے نقاب رہا۔ وہ بھی اس زمانہ میں جب علی گڑھ اپنے طنطنہ و دبدبہ کے نصف النہار پر تھا۔ جب یہاں دوسرے درجے کی کوئی بات معاف نہیں کی جاتی تھی اور ہر شخص کی ہر حرکت میزان میں تلتی رہتی تھی جو بڑی ہی بے درد و بے خطا تھی۔'' (۷)

رشید صاحب کی عبارتوں کے اچھوتے پن کو واضح کرنے کے لیے یہ اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ ''ذاکر صاحب'' والے مضمون میں اُن کی تقریر کے متعلق رشید صاحب نے لکھا ہے:

''ہر طرح کے تکلفات سے قطعاً بری، رواں، جچی تلی، دل نشین، فکر انگیز، انگریزی تقریب نے ذاکر صاحب ہی کی زبان سنی۔ ان کی تقریر کا ایک جملہ بھی زائد از ضرورت نہیں ہوتا اور شروع سے آخر تک استوار اور شریفانہ اور ہر فقرے میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔ آپ ان کے کسی فقرے کے ابتدائی الفاظ سن کر یہ نہ بتا سکیں گے کہ اس فقرے کی یہ پرداخت ہوگی یا یوں ختم ہوگا، ہمیشہ وہ اس کو اس طرح ختم کریں گے کہ آپ متحیر بھی ہوں گے اور خوش بھی۔'' (۸)

اگر ذاکر صاحب کی انگریزی تقریروں کے متعلق رشید صاحب کی یہ رائے صحیح ہے تو اردو ادب میں ذاکر صاحب کی انگریزی تقریروں سے ملتی جلتی جو چیز ہے وہ رشید صاحب کی تحریریں ہیں۔ یہاں دو باتیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ رشید صاحب کی رائے ہر جگہ جچی تلی ہو یا نہ ہو لیکن وہ اندازِ واقعہ بڑے جچے تلے ہوتے ہیں جن میں وہ رائے ظاہر کی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ رشید صاحب کے فقرے کے ابتدائی الفاظ یا انداز سے پیدا ہونے والی حیرت اور مسرت یقینی ہے۔ رنگینی و رعنائی، شستگی و شگفتگی، لطف و لطافت اور وزن وقار کے اعتبار سے اردو کے دوسرے انشا پردازوں کا پلہ رشید صاحب پر بھاری ہو لیکن جہاں تک فقروں اور جملوں کی تازگی اور اندازِ بیاں کی برجستگی و بے ساختگی کا تعلق ہے رشید صاحب اپنا جواب آپ ہیں۔

رشید صاحب کے یہاں ایک اور چیز ملتی ہے جو دوسروں کے یہاں نظر نہیں آتی وہ یہ کہ ان کی جو باتیں جتنی زیادہ گہری اور اہم ہوتی ہیں انہیں وہ اتنے ہی سرسری اور ضمنی طور پر کہہ جاتے ہیں۔ وہ ان باتوں کو کہنے یا ان پر زور دینے کے لیے خود نہیں رُکتے لیکن وہ باتیں پڑھنے والے کو ضرور روکتی ہیں مثلاً:

''شاعری اصناف سخن میں نہ کبھی قید ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ زندگی کے بدل جانے سے شاعری کی وضع قطع، موضوع، اسلوب و انداز کا بدل جانا بھی کوئی قیامت نہیں۔ ایسا ہوتا رہا ہے، ہونا چاہیئے اور ہو کر رہے گا۔ وضع قطع اور موضوع میں مقید کرنا، پروپیگنڈہ مجھے دونوں سے کسی ایک پر بھی فخر نہیں۔''(۹)

اس عبارت کے آخر میں کتنے پتے کی بات کہی گئی ہے لیکن کس قدر سرسری۔۔۔رشید صاحب کی تنقید نگاری اگر چہ کبھی کبھار کا مشغلہ ہے پھر بھی انہیں نقاد کی حیثیت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو میں وہ اپنی طرز کے واحد نقاد ہیں۔ اس خصوصیت کے ساتھ کہ ان کا طرزِ تنقید نہ مشرق سے مستعار ہے نہ مغرب سے مغلوب۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اپنے اسلوبِ نقد کے پیش رو بھی ہیں اور جانشین بھی۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''میں کسی ایسی تنقید کا قائل نہیں ہوں جس کے سانچے ڈھلے ڈھلائے پہلے سے موجود ہوں بنے بنائے اصول باہر سے کمیشن پر منگوانا اور کام نکل جانے پر کارخانہ کو واپس کر دینا تنقید نہیں نالائقی ہے۔ شاعری کا کوئی کارخانہ نہیں ہوتا جہاں فرمائش کی چیزیں بالکل نپی تلی ایک ہی طرح کی بے شمار تعداد میں نکلتی ہوں۔ شاعری مشینی عمل نہیں ہے۔ شخصی کردار ہے۔ جس کو سمجھنے اور سمجھانے کیلئے تنقید کے اصول اتنے ضروری نہیں ہوتے جتنا خود شاعر کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔''(۱۰)

یہ عبارت رشید صاحب کے نظریۂ تنقید کی ترجمان ہے اور ان کے تنقیدی مضامین اس نظریہ پر ان کے عمل میں نمائندگی کرتے ہیں۔ رشید صاحب تنقید و تبصرے میں دوسروں کا سہارا لینے یا حوالہ دینے کے قائل نہیں۔ یہ بات بہت کم نقادوں میں پائی جاتی ہے لیکن اس سے زیادہ اہم وصف جو خورشید صاحب کو دوسرے تمام نقادوں سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین معلومات افزا ہونے سے زیادہ بصیرت افروز ہوا کرتے ہیں۔ وہ کسی ادیب یا شاعر کے متعلق یہ نہیں بتاتے کہ وہ کن حالات میں پیدا ہوا اور کن مجبوریوں کے تحت جاں بحق ہوا، یا کوئی ادبی تحریک کس انقلاب کی پیداوار تھی اور کن حادثات کا شکار ہو کر رہ گئی۔ ان کے مضامین، ادیبوں، شاعروں، تحریکوں اور نظریوں کے متعلق رموز و نکات کی مالا ہوا کرتے ہیں جس میں زندگی، زمانہ، تہذیب، تمدّن اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں کے بارے میں ان کے اچھوتے اور انوکھے خیالات کے موتی جگمگا رہے ہوتے ہیں۔ بعض ادیبوں اور شاعروں کے متعلق اگر کسی نقاد کی رائے لائق اعتماد نہیں تو نہ سہی دیکھنا یہ چاہیئے کہ مجموعی طور پر وہ شعر

وادب اور زندگی کے متعلق ہماری بصیرت میں کس حد تک اضافہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے رشید صاحب کا مرتبہ بلند تر نظر آتا ہے۔ انہوں نے بہت سے ادبی اور فکری مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں۔

سرور صاحب نے لکھا ہے کہ رشید صاحب کو نئے خیالات سے خدا واسطے کا بیر تو نہیں مگر وہ اس نئے پن کو پوری طرح ہضم نہیں کر پاتے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن رشید صاحب جس طرح اپنے حافظہ کی کمزوری کے باوجود برمحل شعر کا حوالہ دینے میں خاص کمال رکھتے ہیں۔ اسی طرح نئے خیالات کے علم برداروں اور نئے ادب کے پرستاروں سے متعلق جو باتیں کہی ہیں وہ بڑی حد تک معقول بھی ہیں اور مفید بھی۔ رشید صاحب ادب اور زندگی کے رشتہ کے قائل ہیں اور ادیب وادب پر عوام کے حقوق کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر وہ اسے پسند نہیں کرتے کہ ادب ہندوستان کا اور زندگی ماسکو کی۔ یا ادب میں ادیب کے سوا ہر کس و ناکس کی جلوہ گری پائی جائے۔ یہ ہر کس و ناکس کو شعر وادب کے جواہر پاروں سے دے دیا جائے۔ ان کے اس خیال میں بڑی صداقت بھی ہے اور وزن بھی کہ:

> ''اچھا اور بڑا شاعر کسی مخصوص طبقہ کا شاعر نہیں ہوتا وہ ہر طبقہ اور ہر عہد کا شاعر ہوتا ہے۔ ''اشتراکی نظام'' کا اچھا اور بڑا شاعر اتنا ہی قابل قدر اور قابل فخر ہوگا جتنا کسی اور نظام کا اچھا اور بڑا شاعر خواہ وہ نظام آج سے ہزاروں سال پہلے تھا یا ہزاروں برس بعد آئے۔''(۱۱)

اسی طرح ان کا یہ خیال بھی صحت وصداقت سے دوُر نہیں کہ ''آرٹ ہو یا ادب اس کا کاروبار قطعاً ذاتی اور انفرادی ہوتا ہے'' اس خیال سے تو حلقۂ ارباب ذوق والوں مسرور ہونا چاہیے، نہ ترقی پسندوں کو مایوس کیونکہ رشید صاحب کے نزدیک شعر وادب میں نہ تو انفرادیت کے معنی اس دھند لکے میں اسیر رہنے کے ہیں جس میں حلقۂ ارباب ذوق والے اسیر ہیں اور نہ اجتماعیت و معنی اس تہلکے اور تبلیغ کے ہیں جس میں ترقی پسند راہ مصروف و مبتلا ہیں۔ وہ شعر وادب میں انفرادیت اور اجتماعیت کو متوازی اور متوازن رکھنے کے قابل ہیں۔ اس اصول کی افادیت سے کون انکار سکتا ہے۔ اگر رشید صاحب نے ایک طرف اس کا مطالبہ کیا ہے:

> ''شاعری کی ڈفلی بھی اپنی ہو اور راگ بھی اپنا''

تو دوسری طرف انہوں نے یہ بھی کہہ دیا:

> ''میں ادب، آرٹ اور زندگی سب کو علیحدہ علیحدہ اور بہ حیثیت مجموعی بھی صرف سلیقہ، شرافت اور سرفروشی سمجھتا ہوں۔ ادب انسانیت سے خارج نہیں ہے اور انسانیت کا کوئی ایسا مفہوم نہیں

ہے جس کو آپ کچھ اور سمجھتے ہوں اور ہم کچھ اور۔ انسانیت کو انسانیت ہی کہتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔۔۔ذہنی دنیا میں رہنا یا داخلی شاعری کی آڑ پکڑنا میرے نزدیک یکسر مہمل ہے اگر شاعر اپنے آپ کو خارج سے بے نیاز کر لے اور خارج کو توڑنے مروڑنے اور سلجھانے سنوارنے میں خون پسینہ ایک نہ کر دے یا نہ کر سکے۔'' (۱۲)

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ رشید صاحب شعر و ادب میں انفرادیت اور اجتماعیت کا ایسا امتزاج دیکھنا چاہتے ہیں جس کے بغیر کسی کا شعر و ادب نہ مفرد بن سکتا ہے نہ مفید۔ سرور صاحب نے ان کی تنقید نگاری کے متعلق ایک بات یہ کہی ہے:

''تنقید میں اگرچہ انہوں نے کبھی کبھار کسی اچھی چیز کی تعریف نہ کی، لیکن آج تک میں نے ان کی کوئی ایسی تنقید نہ دیکھی جس میں کسی پست اور ناقص کارنامے کو انہوں نے سراہا ہو۔'' (۱۳)

رشید صاحب فی الواقع اہتمام کرتے ہیں یا نہیں لیکن ان کے مضامین پڑھتے وقت معلوم ایسا ہوتا ہے جیسے لکھنے والے نے یہ عبارت بغیر کسی سعی و کاوش کے لکھی ہے۔ چنانچہ ان کی تحریریں پڑھنے کے دوران میں ''حسنِ بے پروا'' کی ترکیب اکثر یاد آتی ہے لیکن ان کی نگارشات میں ''حسنِ بے پروا'' کے باوجود الفاظ کا بہت ہی صحیح اور حیرت انگیز انتخاب ملتا ہے۔ بعض اوقات ان کا صرف ایک لفظ پورے ماحول اور سارے حالات کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ اقبالؔ کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اقبال جو کچھ کہتے تھے راز داں کی حیثیت سے کہتے تھے۔ ہم مغرب کا نام لے کر جب اور جس طرح چاہتے تھے مشرق کو سنگسار کر دیتے تھے لیکن اقبال کے کہے کو کس طرح ٹال سکتے تھے جو ہم سے زیادہ یورپ کو پرکھ چکے تھے۔'' (۱۴)

یہاں ''سنگسار'' کا لفظ کس طرح برمحل ہے۔ مغرب کے اثر سے مغرب کی طرف اہلِ مشرق کا جو رویہ تھا اس کی مصوری کے لیے ''سنگسار'' کا لفظ رشید صاحب ہی استعمال کر سکتے تھے۔ پھر یہ لفظ نہ صرف خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے بلکہ بڑی بے تکلفی سے بھی۔ اکبر الہ آبادی کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اکبر نے اردو شاعری کے ساتھ جتنی بے تکلفی برتی ہے ان سے پہلے شاید ہی کسی نے برتی ہو۔ انہوں نے جو موضوع چاہا اختیار کر لیا جو زبان چاہی استعمال کر ڈالی جو لہجہ جی میں آیا اختیار کیا۔ زبان، اسلوب اور موضوع ہر اعتبار سے وہ ہر طرح کے جذبات و خیالات

کے اظہار پر قادر تھے اس لئے وہ ہر بات نہ صرف یہ کہ فی الفوراور
براہ راست کہہ دیتے تھے بلکہ کہنے کے بجائے اسے سامنے لاکھڑا
کرتے تھے۔'' (۱۵)

اردو نثر کے ساتھ جتنی بے تکلفی رشید صاحب نے برتی ہے ان سے پہلے اور خود ان کے دور میں کسی اور نے ہرگز نہیں برتی۔ اکبر کی طرح انہوں نے بھی جو موضوع چاہا اختیار کرلیا، یا آل انڈیا ریڈیو دہلی کی خاطر اختیار کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن موضوع کو ہمیشہ اپنی گرفت میں رکھا۔ خود کبھی موضوع کی گرفت میں نہ آئے۔ جہاں سے جی چاہا مضمون شروع کر دیا اور بھٹکنے کے باوجود عنوان اور موضوع کو ایک دوسرے سے بے تعلق نہ ہونے دیا۔ لیکن جس موضوع کے متعلق جو بات بھی کہنا چاہی اسے کم سے کم لفظوں میں جلد سے جلد کہہ دیا۔ بلکہ اکبر کی طرح کہنے کی بجائے اسے سامنے لاکھڑا کیا۔ ان باتوں کی صحت کا صحیح اندازہ صرف رشید صاحب کی تحریریں پڑھنے سے نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ایک ہی موضوع پر مختلف تحریریں دیکھیں اور پھر یہ بھی دیکھیں کہ جو چیز دوسروں کے یہاں موجِ نفس کی حیثیت رکھتی ہے وہ رشید صاحب کے یہاں نکہت گل کس طرح بن جاتی ہے۔ اقبال کے متعلق پہلے ایک ایسے ہی ادیب کی چند سطریں ملاحظہ فرمائیے جو دورِ حاضر کے نہ صرف بڑے نقادوں میں سے ہے بلکہ ایک خاص اسلوب کا مالک بھی ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو قعرِ مذلّت
سے نکال کر رفعت فلک پر پہنچانے کیلئے اقبال نے تعلیماتِ اسلام
کا زینہ اختیار کیا۔ مگر یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ یہ نسخہ پرانا ہے اور
مسلمانوں کو مرض پستی سے نجات دلانے کیلئے مصلحین اسلام نے
بار بار یہی مداوا تجویز کیا۔ مگر اس کا حاصل کچھ نہ ہوا کتنے خطیبوں،
واعظوں اور مقرروں نے منبر پر کھڑے ہوکر ان الفاظ کو دہرایا ہے
کہ مسلمانو! تمہاری پستی وذلت کا سبب صرف یہ ہے کہ تم نے احکام
اسلام کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ تم تعلیمات اسلام سے بے بہرہ
ہو گئے ہو۔ تم نے خدا اور رسولؐ کی نافرمانی پر کمر باندھی ہے اگر تم پکے
اور سچے مسلمان بن جاؤ۔ اگر تم سلف صالحین کے نقشِ قدم پر چلنے
لگو تو آج پھر تم دنیا میں سر بلندی حاصل کر سکتے ہو۔ پھر ایک بار دنیا
کے تخت وتاج تمہارے قدموں پر پڑے ہوں گے۔'' (۱۶)

کتنی شستہ وشگفتہ عبارت ہے۔ نوک پلک سے درست، زبان وبیان کی خامیوں سے پاک، لطف ولطافت سے بھر پور لیکن انہی باتوں کو رشید صاحب کے الفاظ میں دیکھئے:

''اقبال نے زیادہ تر وہیں باتیں کہی ہیں جو قرآن وحدیث میں ہیں۔ ائمہ کے اقوال میں ہیں، بزرگوں کے کارناموں میں ہیں اب ہمارا حال یہ ہے کہ اگر ہم یہ کہیں یا سنیں کہ قرآن میں یہ آیا ہے، رسول کا یہ ارشاد ہے، بزرگوں نے یہ فرمایا تو ہم پر اس کا اثر نہیں ہوتا، لیکن بالکل انہی باتوں کو جب اقبال اپنی زبان سے اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں تو ہم وجد میں آجاتے ہیں۔ اس پر ایمان لے آئے ہیں، اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس کی آڑ پکڑتے ہیں اور اس پر اڑ جاتے ہیں یہ آخر کیوں؟ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ہمارے ذہن ودماغ کے کئی گوشے اور زاویے ہیں۔ بعض چھپے ہوئے تار جب کوئی پہنچا تا ہوان کو پہچان کر چھیڑ دیتا ہے تو پھر زندگی اور عمل کے نغمے بیدار ہوجاتے ہیں اور بند اٹے ہوئے سوتے کھل جاتے ہیں اور ہم فوراً محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم بھی کچھ ہیں اور بہت کچھ کرسکتے ہیں۔'' (۱۷)

اگر مندرجہ بالا دو عبارتوں میں کسی ایک کا اقتباس دینا ہو تو رشید صاحب ہی کی عبارت قابلِ ترجیح ہوگی۔ اس لیے کہ رشید صاحب نے اس عبارت میں جو باتیں جس سادگی، بے ساختگی اور ایجاز واختصار کے ساتھ یاد رہنے اور رکھے جانے والے انداز میں کہہ دی ہیں وہ باتیں اس طور پر دوسرے صاحب کے یہاں ادا نہ ہوسکیں۔ حالانکہ جس طور پر انہوں نے وہ باتیں ادا کی ہیں وہ خود بھی خوبیوں سے خالی نہیں۔ کسی بات یا خیال کو ان سے پہلے دو ہزار شخصیتوں نے کیوں نہ بیان کیا ہو لیکن جب اس بات یا خیال کو رشید صاحب بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نفسِ خیال کے اعتبار سے وہ بات جس کی بھی ہو حسنِ بیان کے اعتبار سے اس پر سب سے زیادہ حق رشید صاحب کا ہے۔ جب کہیں اس بات کا حوالہ دینا ہو تو سب سے پہلے انہیں کے جملوں کی طرف نظر جائے گی، کیونکہ اردو میں ان سے زیادہ حوالہ دینے کے انداز میں بات کہنے والا کوئی اور نہیں۔

رشید احمد صدیقی کا تنقیدی میدانِ فکر میں ایک انفرادیت، عظمت ووقار اور توازن کا حامل ہے۔ جہاں ایک طرف وہ کسی نئے اور اچھوتے خیال کے سہارے اس کی تشکیل کرتے ہیں اور اس طرح اپنی جملہ تحریروں میں ایک جہانِ معنی آباد کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہیں ان کا اسلوب شگفتہ، برجستہ اور دلوں میں گھر کرنے والا ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں اور کسی بھی فن پارہ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ ان کی تنقید تخلیق کے درجے پر پہنچ جاتی ہے۔ کسی بھی فن کار کے فن کا تجزیہ کرتے وقت رشید صدیقی اپنے تاثرات

کو بلا تکلف اور بے ساختگی اور ایجاز واختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور یہی ان کی تنقید کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۷ء، ص:۴۵

۲۔ ابن فرید، رشید صاحب کی تنقیدی بصیرت، مشمولہ: رشید احمد صدیقی شخصیت اور ادبی قدر و قیمت، از پروفیسر ابوالکلام قاسمی، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۹۰ء، ص:۸۲۔۱۸۱

۳۔ رشید احمد صدیقی، غزل، غالب اور حسرت، مرتبہ: ڈاکٹر سیّد معین الرحمان، لاہور: الوقار پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص:۱۲۳۔۱۲۲

۴۔ نظیر صدیقی، رشید احمد صدیقی، مشمولہ: رشید احمد صدیقی شخصیت اور ادبی قدر و قیمت، از پروفیسر ابوالکلام قاسمی، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۹۰ء، ص:۲۰۳

۵۔ رشید احمد صدیقی، غزل، غالب اور حسرت، مرتبہ: ڈاکٹر سیّد معین الرحمان، ص:۱۲۴

۶۔ لطیف الزماں، مہر الٰہی ندیم، مرتبین: میزان نثر، جلد سوم، کراچی: مکتبہ دانیال، جون ۲۰۰۰ء، ص:۳۳۶

۷۔ لطیف الزماں، مہر الٰہی ندیم، مرتبین: مرشد ذاکر صاحب، ہمارے ذاکر صاحب، کراچی: مکتبہ دانیال، باراوّل، ۱۹۹۲ء، ص:۵۲۔۴۸

۸۔ ایضاً، ص:۶۵

۹۔ رشید احمد صدیقی، غالب نکتہ داں، مرتبہ: لطیف الزمان، مہر الٰہی ندیم، کراچی: مکتبہ دانیال، جنوری ۱۹۹۷ء، ص:۵۷

۱۰۔ نظیر صدیقی، مرتبہ: شیرازہ خیال، ملتان: کاروان ادب، باراوّل، ۱۹۷۷ء، ص:۱۳۰

۱۱۔ ایضاً، ص:۲۱۵

۱۲۔ رشید احمد صدیقی، غزل، غالب اور حسرت، مرتبہ: ڈاکٹر سیّد معین الرحمان، ص:۳۳۔۲۸

۱۳۔ آل احمد سرور، پروفیسر، رشید احمد صدیقی، مشمولہ: رشید احمد صدیقی شخصیت اور ادبی قدر و قیمت، از پروفیسر ابوالکلام قاسمی، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۹۹ء، ص:۵۳

۱۴۔ رشید احمد صدیقی، پیام اقبال، مرتبین: لطیف الزمان، مہر الٰہی ندیم، کراچی: مکتبہ دانیال، ۳۱ دسمبر ۱۹۹۷ء، ص:۷۵

۱۵۔ لطیف الزمان، مہر الٰہی ندیم، مرتبین: میزان نثر، جلد چہارم، کراچی: مکتبہ دانیال، دسمبر ۲۰۰۰ء، ص:۲۶۷

۱۶۔ ابوالکلام قاسمی، پروفیسر، رشید صاحب کی تنقید، مشمولہ: رشید احمد صدیقی شخصیت اور ادبی قدر و قیمت، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۹۰ء، ص:۳۵

۱۷۔ رشید احمد صدیقی، پیام اقبال، مرتبین: لطیف الزمان، مہر الٰہی ندیم، ص:۹۲۔۸۹